گناہوں کا شعور پیدا کریں جس سے روحانی فراست ملتی ہے۔ تنقید جزام کا مرض بن جاتی ہے

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۸ / نومبر ۱۹۸۸ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور نے درج ذیل آیت کریمہ تلاوت کیں:۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (الحشر: ۱۱)

گزشتہ ایک خطبہ میں میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ نے ایک موقع پر بدھ کے دن کو منحوس قرار دیا۔ وہ خطبہ جب مختلف جماعتوں میں پہنچا تو معلوم ہوتا ہے بعض لوگوں کو اس سے غلط فہمی ہوئی اور وہ حدیث کے مفہوم کو صحیح سمجھ نہیں سکے۔ جہاں تک دنوں کا تعلق ہے فی الحقیقت کوئی دن بھی منحوس نہیں بلکہ بعض دنوں میں گزرنے والے ماجرے بعض دنوں کو منحوس بنا دیتے ہیں اور بعض دنوں کو مبارک دن بنا دیتے ہیں۔ خود حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ نے سوال کرنے والے کے سوال کے جواب میں جو مثال بیان فرمائی اس پر اگر تدبر کیا جاتا تو کبھی یہ غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔ حضور اکرم ﷺ کا کلام ایک عام انسان کا کلام نہیں اور کلام کلام کرنے والے کے رتبے اس کے مقام سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک ہی بات ایک عام آدمی کہتا ہے اس کی بات میں گہرائی اور ہوتی ہے اور وہی بات ایک اور شخص کہتا ہے تو اس کی بات میں اور زیادہ گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ کلام الٰہی اور کلام انسانی میں یہی فرق ہے۔ قرآن کریم کا مطالعہ کریں ایک سطحی معنی آپ کے ذہن پر ابھرتے

ہیں لیکن جوں جوں آپ مزید تدبر کرتے چلے جائیں اس کی گہرائی میں اور زیادہ معارف کے موتی آپ کو نظر آنے شروع ہوں گے یہاں تک کہ انسان اپنی فکر کے مطابق جتنی بھی جستجو کرتا چلا جائے کلام الٰہی کی گہرائی کسی ایسے مقام پر نہیں پہنچ سکتی جہاں اس سے آگے رستے بند ہوں، جس کے بعد کوئی آگے مقام نہ آتا ہو۔

یہی مضمون کائنات پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس نے اپنی جستجو میں معارف کے منتہا کو پالیا ہو۔ وہی خدا جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے وہی قرآن کریم کا خدا بھی ہے۔ اس لئے جس طرح دنیا کے معارف یعنی مادی دنیا کے معارف لامنتہا ہیں اور کوئی دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر اور مدبر اور سائنس دان بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس چھوٹی سی حقیقت کے پس پردہ جتنی حقیقتیں بھی تھیں ہم نے سب کو پالیا ہے۔ جوں جوں وہ جستجو کا سفر آگے بڑھاتے ہیں نئے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور جستجو کے نئے میدان ان پر روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس نسبت سے اللہ کے کلام کے بعد سب سے زیادہ پر معارف، سب سے زیادہ گہرا کلام حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کا کلام ہے۔ ایک شخص نے سوال یہ کیا کہ کون سا دن منحوس ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں آپؐ نے بدھ کا دن بیان کر کے اس کی وجہ بیان فرمائی۔ فرمایا اس دن فرعون اپنے انجام کو پہنچا اور خدا کی قہری تجلی اس پر گری (الدر المنثور صفحہ: ۶۷۷ زیر آیت انا ارسلنا۔ سورۃ قمر: ۱۹) اور چونکہ وہ خدا کے غضب کے اظہار کا دن تھا اس لئے وہ منحوس دن تھا لیکن اسی دن حضرت موسیٰ نے نجات بھی تو پائی تھی۔ وہ دن حضرت موسیٰؑ کے لئے مبارک دن بھی تو تھا۔ غور کرنے والے کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ خدا کے عذاب کا دن ان لوگوں کے لئے منحوس ہے جن پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے نہیں جن کی وجہ سے وہ عذاب نازل ہوتا ہے۔ جن کو بچانے کے لئے وہ عذاب نازل کیا جاتا ہے۔ پس ایک پہلو سے دن منحوس ہے دوسرے پہلو سے وہی دن برکتوں والا دن بن جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ایک بھی دن ایسا نہیں آیا، ایک دن کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جسے آپ منحوس قرار دے سکیں۔

پس اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ دن نے نحوست پیدا نہیں کی تھی بلکہ فرعون نے اس دن کو منحوس بنایا تھا۔ ہر مکان کو اس کے مکین سے شرف حاصل ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح زمانے کا بھی ایک ظرف ہے۔ اس ظرف میں جو کام کئے جاتے ہیں وہ زمانے کو منحوس بھی بنا دیا کرتے ہیں اور مبارک بھی کر دیا کرتے ہیں۔ پس بدھ کا دن ایک پہلو سے منحوس تھا ان لوگوں کے نقطہ نگاہ سے جن پر خدا کا

عذاب نازل ہوا اور ایک پہلو سے بے انتہا مبارک دن تھا جو تاریخ میں کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکے گا کیونکہ اس دن خدا نے ایک مظلوم قوم کو ایک ظالم کے پنجہ سے نجات بخشی تھی۔

اس پہلو سے جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہامات کی روشنی میں اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات کی روشنی میں ہم بدھ کے دن پر غور کرتے ہیں تو یقیناً اس میں جہاں بعض نحوستیں ہیں وہاں جماعت احمدیہ کے لئے بہت سی برکتیں بھی ہیں لیکن ان برکتوں کے دور کے بعد ابتلاؤں کے دور بھی ہوا کرتے ہیں اور ان برکتوں کو حاصل کرنے کا اہل بنانا ان لوگوں کا کام ہے جن کی خاطر وہ برکتیں مقدر کی جاتی ہیں۔

اس دن کے بعد جس دن حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اور آپ کی قوم کو نجات عطا ہوئی اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ خدا کے بہت سے وعدے تھے ان کے حق میں لیکن بدقسمتی سے قوم کی بداعمالی کی وجہ سے وہ وعدے ٹل گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ برکتیں بھی جو مقدر ہوتی ہیں اگر ان کا اہل انسان اپنے آپ کو ثابت نہ کرے تو وہ برکتیں بھی ٹل سکتی ہیں۔ اگر چہ خدا کے وعدے بالآخر ضرور پورے ہوتے ہیں لیکن بعض دفعہ تاخیر کے ساتھ پورے ہوتے ہیں۔ اس لئے جن خدا کے بندوں کے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے نشان دکھائے جاتے ہیں ان بندوں پر بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جنہیں انہیں بہر حال ادا کرنا ہوگا۔

ان امور کے پیش نظر میں جماعت کو ان دنوں میں خصوصیت سے دعا کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ ہم ایک خاص سال کے عرصہ سے گزر رہے ہیں **جو ابتہال کا سال ہے، جو دعاؤں کا سال ہے، جو روحانی مقابلوں کا سال ہے** اور یہ دوڑ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ بہت سے دشمن ایسے ہیں جنہوں نے ہار تسلیم نہیں کی۔ جو خدا کی تقدیر کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہوئے بھی پھر بھی اس سے ٹکرانے کا عزم لئے ہوئے ہیں۔ وہ خدا کی تقدیر کا رخ تبدیل کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سی سازشیں ہو رہی ہیں، بہت سے بدارادے منصوبوں کی شکل میں ڈھالے جا رہے ہیں اور بہت سے خطرات ہیں جو ابھی جماعت کو درپیش ہیں۔ اس لئے ان ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

تربیت کے مضمون سے متعلق جو میں نے خطبات کا سلسلہ شروع کیا تھا وہ اسی امر کے پیش نظر کیا تھا لیکن جہاں تک دن کے مبارک ہونے کا تعلق ہے۔ بدھ کا دن یقیناً جماعت کے لئے مبارک ہے لیکن اس کی برکتوں کے حصول کے لئے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی باقی ہیں۔ اس لئے

جماعت کو دعائیں جاری رکھنی چاہئے اور ساری جماعت کو ان دعاؤں میں شامل ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں ایک بہت اہم نقطہ میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں اجتماعی دعاؤں کی دو طرح سے برکتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اجتماعی دعا انسان کو شرک سے پاک کرتی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کی دعا لگی تھی۔ **حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تو بعض دفعہ ایک اچھی دوا کے ساتھ جس کے متعلق اعتماد ہوا کرتا تھا کہ یہ دوا کسی خاص بیماری میں مفید ہے اور دوائیں بھی شامل فرما لیا کرتے تھے اور اس نیت سے شامل فرمایا کرتے تھے کہ میرا کہیں زیادہ انحصار اس دوا پر نہ ہو جائے اور نہ کہہ سکوں کے خدا کی پیدا کردہ چیزوں میں سے کس نے مجھے زیادہ شفا بخشی تھی اور توجہ اسی طرف مبذول رہے کہ خدا نے شفا بخشی تھی بعض چیزوں میں اور ان چیزوں سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس لئے اجتماعی دعا میں بھی ایک گہرا فلسفہ ہے اور وہ توحید کا فلسفہ ہے۔**

جب ساری جماعت دعا کرتی ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس کی دعا مقبول ہوئی۔ بحیثیت مجموعی سب جماعت خدا کے حضور عجز کرتی ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اجتماعی دعا مجموعی شکل میں ایک اثر دکھاتی ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اجتماع میں شریک کثرت سے لوگوں کے دلوں پر مختلف واردات مختلف وقتوں میں طاری ہوتی ہیں، ان کے دلوں پر واردات پیدا ہوتی ہیں اور وہ خاص کیفیات دعا کی مقبولیت کے لئے ایک مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ اس لئے بہت بڑی تعداد میں جب جماعت دعا کر رہی ہوتی ہے تو جس طرح جگنو چمکتے ہیں اندھیرے میں بیشمار جگنو ہیں ان میں کچھ بجھ بھی گئے ہوتے ہیں کچھ جل بھی رہے ہوتے ہیں لیکن مجموعی تاثر یہی ہوتا ہے کہ رات روشن ہوگئی ہے۔ مشرقی بنگال میں ایک دفعہ یہ سندر بن کے علاقے میں میں نے یہ نظارہ دیکھا۔ سارا جنگل کا جنگل روشن ہوا ہوا تھا اور جگنوؤں کی وجہ سے روشن ہوا ہوا تھا لیکن باوجود اس کے کہ تقریباً نصف جگنو ایک وقت میں بجھے ہوئے ہوتے تھے لیکن کچھ دوسرے جگنو چونکہ روشن ہوتے تھے اس لئے ایک لمحہ بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا جبکہ تاریکی ہو تو اجتماعی دعا کی برکت سے خدا کے بعض بندوں کے دلوں میں مختلف تحریک مختلف وقتوں میں پیدا ہو رہی ہوتی ہے اور ان کو قبولیت کے لمحے عطا ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سارے عرصے میں کوئی ایک لمحہ بھی مومن کی اجتماعی زندگی پر ایسا نہیں آتا جس میں روشنی نہ ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ کثرت کے ساتھ تمام دنیا کے احمدی مسلسل دعاؤں میں مصروف رہیں۔

جہاں تک دعا کے لمحات کا تعلق ہے اس سلسلے میں بھی کچھ وضاحت پیش کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دعا کا خاص لمحہ نصیب ہو۔ وہ بھی دراصل مضمون کو الٹ دیتے ہیں۔ جس طرح دن نحوست پیدا کیا کرتا ہے نہ برکت پیدا کیا کرتا ہے۔ دلوں میں پیدا ہونے والے واقعات نحوست بھی پیدا کرتے ہیں اور برکت بھی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح دعاؤں کے لمحے دلوں سے پیدا ہوتے ہیں کوئی بیرونی وقت کا اثر ہرگز نہیں جو دعاؤں کو مقبول لمحے عطا کرتا ہو۔ کیفیات ہیں اور ان کیفیات کا تعلق خدا تعالیٰ کی شان سے ہے۔ قرآن کریم نے اس فلسفے کو اس طرح بیان فرمایا کہ : كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمٰن:۳۰) کہ خدا ہر لمحے اپنی ایک خاص شان میں ہے۔ بعض لوگ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ بعض خدا کی شانیں مقبولیت کی شانیں ہیں اور بعض نامقبولیت کی شانیں ہیں اور ہمیں مقبولیت والی شان نصیب ہو۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ خدا کی ہر شان مقبولیت کی بھی ہوسکتی ہے اور غیر مقبولیت کی بھی ہوسکتی ہے۔ مقبولیت کی اس وقت ہوگی جب آپ کے دل کی شان خدا کی شان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ جب آپ دنیا میں آپس میں معاملات کرتے ہیں تو جس انسان کے مزاج کو آپ سمجھتے ہوں اس کے مزاج کے لمحات کے مطابق اس سے بات کرتے ہیں اور اگر آپ اسے صحیح سمجھتے ہوں اور اچھی طرح خوب پہچانتے ہوں تو اس شخص کے مزاج کا ہر لمحہ آپ کے لئے مقبول لمحہ بن جاتا ہے۔ اگر آپ کسی کا مزاج نہ سمجھتے ہوں اور اس کے مزاج کے کسی خاص لمحے کے برخلاف بات اس سے کریں اور اگر آپ بالکل نہ سمجھتے ہوں اور ہمیشہ مخالفانہ بات کریں تو آپ کی ہر بات اس کے حضور نامقبول ٹھہرے گی۔ ہم آہنگی ہے جو قبولیت دیا کرتی ہے۔ اس لئے خدا کی شان کے مطابق جب ایک کثرت سے جماعت دعا میں مصروف ہو کسی نہ کسی کے دل کو وہ ہم آہنگی کا لمحہ نصیب ہو جایا کرتا ہے اور وہی مقبولیت کی شان پیدا کیا کرتا ہے۔ جس طرح سائنس کی دنیا میں لیزر بیم (Laser Beam) کا فلسفہ ہے کہ وہ مادہ جس کی Wavelength جس کی لہروں کے انداز، ان کے فاصلے آپس میں، ان کے زیر و بم کے طریق لیزر کی لہروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں تو اس سے ایک غیر معمولی لہر اٹھتی ہے جو عام لہروں سے اتنی بلند ہوتی ہے کہ اس کی کوئی نسبت ہی نہیں ہوا کرتی۔

پس جب آپ کے دل کی کیفیت خدا کی کسی شان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے، خاص ایسا جذبہ

آپ کے دل میں پیدا ہو جو خدا کی اس شان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو اس وقت خدا دکھا رہا ہے تو اتنی غیر معمولی ایک دعا کی لہر آپ کے دل سے اٹھتی ہے کہ اس کی موجیں خدا کی رحمت کے پاؤں پر چھلکنے لگتی ہیں اور اسے نمدار کر دیتی ہیں اور ناممکن ہے کہ پھر وہ دعا نامقبول ہو۔ تو اگر ساری جماعت اسی طرح دعاؤں میں لگی رہے، جماعت کے ہر فرد کے مختلف جذبات ہیں، مختلف کیفیات ہیں، مختلف ان کی پاکیزگی کے حالات ہیں، مختلف خلوص کے حالات ہیں۔ توحید کا عرفان بھی ہمیشہ ایک سا نہیں رہا کرتا، بعض اوقات توحید کا عرفان ایک خاص شان کے ساتھ انسان کے سامنے ابھرتا ہے، ایسے لمحات جب خدا کی کسی شان سے ہم آہنگ ہوتے ہیں تو اس دعا میں سے ایک عظیم قوت اٹھتی ہے اور دعا کرنے والے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دعا نامقبول نہیں ہو سکتی۔ اس لئے بہت ہی ضروری ہے کہ ہر آدمی خواہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھے یا بڑا سمجھے یا عام دنیا کی نظر میں نیک ہو یا بد ہو دعاؤں میں مصروف رہے۔ احادیث سے پتا چلتا ہے کہ بعض دفعہ بدوں کے دل سے بھی ایک ایسی دعا اٹھتی ہے جو خدا کی کسی شان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور ان کی ساری عمر کی بدیاں ان کو جہنم میں دھکیلنے میں ناکام رہتی ہیں اور اس ایک لمحے کی دعا مقبول ہو جاتی ہے اور اس کی ساری زندگی کی بدیوں کے عذاب سے ان کو بچا لیتی ہے۔ تو حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کا کلام بہت ہی عارفانہ کلام ہے، بہت ہی گہرا ہے اور اس کے مطالب کو سمجھنا چاہئے۔

اس لئے میں جماعت کو متوجہ کرتا ہوں کے دعاؤں میں مصروف رہیں اور دعاؤں کو ادلتے بدلتے رہیں ان کے رخ پلٹتے رہیں۔ یہ بھی ایک قبولیت دعا کا مقام حاصل کرنے کے لئے ایک اچھا راز ہے۔ اس کو سمجھنے سے آپ کو قبولیت دعا کا ایک اور فلسفہ سمجھ آ جائے گا۔ ایک ہی نہج پر ایک ہی طرز پر جس طرح طوطا بولتا ہے یا کوئی بچہ جس نے سبق رٹا ہو وہ سبق پڑھتا ہے اس رنگ میں اگر کوئی دعا کرتا چلا جائے تو ہو سکتا ہے اس کی ساری عمر کی دعا بھی بے معنی ہو۔ اسی لئے وہ لوگ جو وظیفوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں بسا اوقات وہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ وہ ان باتوں کی تلاش میں رہتے ہیں کون سا وظیفہ ملے جو کارگر ثابت ہو۔ حالانکہ اصل وظیفہ وہ ہے جو دل کا تعلق خدا سے پیدا کر دے اور کوئی وظیفہ یہ کام نہیں کر سکتا جب تک اسے سمجھ کر غور کر کے اپنے دل پر طاری کر کے اسے ادا نہ کیا جائے اور دعاؤں میں بھی آپ کو اس طرح دعاؤں کو الٹنا پلٹنا چاہئے کہ آپ کے مزاج میں سے وہ روح نکالیں، آپ کے دل میں ایک گرمی پیدا کریں۔ آپ کی فطرت میں وہ سوز عطا کر دیں جس کے نتیجے میں پھر

دعاؤں میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے دعاؤں کے رنگ بدلنے چاہئیں۔ کبھی کسی رنگ میں کبھی کسی رنگ میں۔ الٹ پلٹ کے دعاؤں کو مختلف رنگ میں اس طرح بیان کرنا چاہئے کہ آپ کو محسوس ہو کہ آپ کے دل میں اس کے ساتھ ایک خاص حرکت پیدا ہوئی ہے، ایک خاص گداز پیدا ہوا ہے۔ محض رونا کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ کیفیات ایسے تجربے ہیں جو اچانک آپ کو نصیب ہوں گے۔ کوشش کریں، محنت کریں اور اپنے ذہن میں ایسے انداز سوچتے رہیں جس سے آپ کے دل میں گرمی پیدا ہو آپ کے مزاج میں ایک خاص قسم کا روحانی لطف پیدا ہو۔ ایسی کوشش کے نتیجے میں پھر وہ لمحے آپ کو نصیب ہو سکتے ہیں جن کے نتیجے میں آپ کے دل کی شان خدا کی کسی شان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے اور پھر از خود اپنی قوت سے ایک دعا اٹھے گی جس کے لئے زور نہیں لگانا پڑتا۔ وہ دعا ایسی دعا ہو گی جو خود بتائے گی کہ میں ایک خاص لمحے کی پیداوار ہوں یا میں وہ دعا ہوں جس نے یہ لمحہ پیدا کیا ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ کو قبولیت کے عظیم الشان نشان دکھائے جائیں گے۔

جہاں تک تربیتی مضمون کا تعلق ہے میں بیان کر رہا تھا کہ بعض دانشور ہوتے تو دانشور ہی ہیں یعنی جہاں تک انسانی پیمانوں کا تعلق ہے ان کی عقل، ان عقل کی جلا وغیرہ اور ان کے طرز فکر کو آپ ایک دانشوری کی طرز فکر اور دانشور کی عقل کی جلا کہہ سکتے ہیں لیکن میں نے قرآن کریم کی اصطلاح میں بیان کیا تھا کہ قرآن کریم سے پتا چلتا ہے کہ دو قسم کے دانشور ہیں ایک وہ ہیں جن کی دانشوری اللہ کی محبت اور بنی نوع انسان سے تلطف اور رحمت کے نتیجے میں جلوے دکھاتی ہے اور حرکت میں آتی ہے۔ وہ رحمت سے اور شفقت سے اپنے لئے قوت متحرکہ حاصل کرتی ہے اور ایک دانشوری وہ ہے جس کا مادہ غیظ ہے، غضب ہے، انتقام ہے اور کوئی احساس کمتری ہے۔ یہ دونوں قسم کے دانشور بالکل مختلف اثر معاشرے پر پیدا کیا کرتے ہیں اور جماعت کو میں نے نصیحت کی تھی کہ ہم میں جو دانشوروں کا ایک طبقہ منفی سوچ والا پیدا ہو رہا ہے ان کو اپنی فکر کرنی چاہئے۔ اگر انہوں نے اپنی فکر نہ کی تو ان کی اولادوں کی بھی ضمانت نہیں بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص خود بچ جائے لیکن اپنی اولادوں کو ہلاک کر دے۔ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ (الانعام: ۱۵۲) میں یہ نصیحت ہے، یہ تنبیہ ہے جسے افسوس کہ بعض لوگ دانشور ہونے کے باوجود اس کو بھلا دیا کرتے ہیں۔ تو دانشوری کی اصل تعریف ان کے اوپر صادق نہیں آتی۔ دانشوری تو وہ ہے جو نتیجے کے اعتبار سے کسی کو بالآخر منفعت بخش دے۔ ہر وہ

دانشوری جو نتیجے کے لحاظ سے کسی کے دامن کو بھرنے کی بجائے اس کے دامن میں جو کچھ ہے وہ بھی چھین کر لے جائے اس کو آپ چالاکی تو کہہ سکتے ہیں اس کو دانشوری نہیں کہہ سکتے۔

سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو کیا کرنا چاہئے کیونکہ میں تو تنقید کی نظر سے تنقید کر ہی نہیں رہا۔ مجھے تو وہ بھی پیارے ہیں جو ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور جماعت میں شامل ہیں اور ان معنوں میں پیارے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام پر ایمان لائے، وقت کی آواز پر انہوں نے لبیک کہا، قربانیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ انہیں دکھ پہنچے اور وہ اور ان کی اولادیں ضائع ہوں۔ تو ایک صرف تنقید مقصود نہیں بلکہ ان کو بچانا مقصود ہے۔ اس کے لئے کیا طریق ان کو اختیار کرنا چاہئے۔ آج میں دو باتیں ان کے سامنے رکھتا ہوں۔

اول یہ کہ ہر تنقید کا جائزہ لیا کریں اور زبان پر بات لانے سے پہلے اپنے دل کو ٹٹولا کریں کہ یہ تنقید پیدا کیوں ہوئی تھی۔ کیا خدا اور اس کی محبت اور اس کے رسول کی محبت کے نتیجے میں یا بنی نوع انسان سے شفقت کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی یا تنقید سے ہم نے کوئی انتقامی جذبہ ٹھنڈا کیا ہے اور تنقید کرتے ہوئے منفی لذت حاصل کرتے ہیں۔ یہ جو نفس کا تجزیہ ہے یہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ دانشوری کا مادہ تو ان میں بہر حال موجود ہے خواہ اس کا رخ غلط ہو جائے بعد میں۔ اس لئے ایسے لوگ جو دوسروں پر تنقید کر سکتے ہیں وہ اپنے اوپر بھی تنقید کی اہلیت رکھتے ہیں۔ بسا اوقات سوچتے نہیں ہیں اس لئے وہ نہیں کرتے۔ اس لئے وہ تنقید کریں اور اس تنقید کے دوران بعض طریق ایسے ہیں جن سے ان کو جلد ہی اپنی بات کی سمجھ آسکتی ہے۔ مثلاً تنقید کرتے وقت ان کو لذت محسوس ہوتی ہے یا دکھ محسوس ہوتا ہے۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو بالکل کھلا کھلا فرق کر دیتی ہیں۔ پھر یہ کہ جس شخص سے کوئی غلطی ہوئی ہے کیا اس کی غلطی کے اوپر ان کو لطف نہیں آیا تھا کہ ہاں! اب میرے یہ قابو آیا۔ انہوں نے محسوس نہیں کیا تھا کہ ہاں اب میں پکڑوں گا اس کو اب کس طرح مجھ سے بچ سکتا ہے، اب جب میں اس کی شکایت کروں گا تو جس کے پاس شکایت کروں گا وہ کس طرح اب اس کی طرف داری کر سکتا ہے اس موقع پر میں نے اس کو پکڑ لیا۔ یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے یا استغفار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ اس سے غلطی ہو گئی، اس سے جماعت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں، میرا بھائی ہے اور بہت سی نیکیاں ہیں لیکن نادانی میں اس نے یہ غلطی کر دی۔ اب یہ دونوں

جذبے الگ الگ ہیں اور اگر انسان باشعور طور پر اپنے نفس کا تجزیہ کرے تو فوراً پہچان سکتا ہے کہ اصل محرک کیا تھا اور حقیقت میں یہ وہ تنقید ہے جو قرآن کریم کے اولی الالباب کیا کرتے ہیں یا وہ دوسری تنقید ہے جو دنیا کے تخریب کار کیا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں بہت سے اور بھی ایسے مابہ الامتیاز ہیں، فرق کرنے والے معاملات جو ایک نفس اپنے نفس پر تنقید کرنے والا اس تنقید کے دوران سیکھ سکتا ہے، معلوم کر سکتا ہے اور اس لمبی بحث میں اس وقت نہیں پڑنا چاہتا لیکن اگر دیانتداری سے کوئی اپنی تنقید کا تجزیہ پہلے کر لیا کرے اور اس پر خوب غور کر لیا کرے تو کئی قسم کی ہلاکتوں سے بچ سکتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے تنقید کرنے والوں کی بیماری کے متعلق یہ فرمایا کہ جب یہ بہت بڑھ جاتی ہے اور عادت مستمرہ بن جاتی ہے جو ان کے ساتھ ہمیشہ کے لئے جڑ جاتی ہے۔ تو اس بیماری کو پھر روحانی اصلاح میں جذام کہا جاتا ہے یعنی کوڑھ کی بیماری اور اس کی پہچان آپ نے یہی بیان فرمائی کھلی کھلی کہ پھر گہری تنقید کا جائزہ لینے کا بھی سوال نہیں۔ یہ بات خوب کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ ایسے شخص دوسرے کی تکلیف سے پھر لذت اٹھانے لگ جاتے ہیں۔ غلطیوں کی بحث نہیں رہتی۔ کوئی بھی کسی پر مصیبت پڑے تو لطف اٹھاتے ہیں اور ایسی باتیں چاشنی کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور کسی کو فائدہ پہنچ جائے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بیماری جذام ہے اور حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: فر من المجذوم فرارک من الاسد (مسند احمد، حدیث نمبر: ۹۳۴۵) کہ مجذوم سے اس طرح دوڑو جس طرح شیر سے ڈر بھاگتے ہو۔ اس پر بہت سے علماء نے بحثیں اٹھائیں ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ جو اتنے شفیق تھے، جو بیماروں کی تیمارداری خود بھی ہمیشہ کیا کرتے تھے اور اسی کی نصیحت فرماتے تھے۔ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ کوئی تکلیف میں مبتلا ہو اور آپ اس تک پہنچیں نہ اگر پہنچ سکتے ہوں یا اپنے غلاموں کو یہ نصیحت نہ کریں کے ان کے گھر تک پہنچو، ان کی عیادت کرو اور عیادت کے مضمون کو آپ نے اس کثرت سے بیان فرمایا، اتنا اٹھایا ہے کہ اہم نیکیوں میں اس کو شامل فرما دیا اور دوسری طرف یہ ارشاد کے فر من المجزوم فرارک من الاسد مجذوم سے اس طرح دوڑو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو۔ بعض علماء نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد روحانی بیماری ہے اور حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

اس بیماری کی نشاندہی بھی فرمادی ہے کہ روحانی اصطلاحوں میں مجذوم ہوتا کون ہے۔

پس اگر ایسے دانشور اپنے قدم وقت پر نہیں روکیں گے تو میں ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ ان کی بیماری بڑھ کر جذام میں داخل ہو جائے گی اور پھر اس کا علاج کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ زندگی بھر ساتھ رہتی ہے اور جس طرح کوڑھی کا ظاہری بدن بیماری کے نتیجے میں بدصورت ہوتا چلا جاتا ہے اور بدشکل ہوتا چلا جاتا ہے اور لوگ اس سے بھاگتے ہیں طبعًا اسی طرح ایسا بیمار جو روحانی طور پر مجذوم ہو جائے اس سے خدا کے نیک بندے واقعۃً بھاگتے ہیں۔ اسے سوسائٹی میں چھوڑ دیا جاتا ہے اس سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں ایسی نفرت جو بے اختیار ہے جو سوچ کر نہیں کی جاتی لیکن یعنی لوگ پسند نہیں کرتے کہ ایسے شخص کی مجلس میں بیٹھیں۔ پس جو اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جو اڈوں کے سردار بن جاتے ہیں وہ چونکہ جذام پھیلانے لگتے ہیں اس لئے وہ نوجوان نسلیں جو ان باتوں کو نہیں سمجھتیں ان کو میں نصیحت کرتا ہوں کہ پھر ان لوگوں کے پاس نہ جایا کریں، ان کے پاس نہ بیٹھا کریں کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے **فر من المجذوم فرارک من الاسد** پھر ان کا مقدر یہی ہے کہ ان کو تنہا چھوڑ دیا جائے ورنہ یہ اس بیماری کو آگے لگائیں گے۔

قرآن کریم نے ایک دعا سکھائی ہے۔ یہ دوسری بات ہے جو میں ان کو سمجھانا چاہتا ہوں اس دعا سے استفادہ کریں اور جب دل میں کسی ایسے مومن بندے کے لئے نفرت پیدا ہو یا غصہ پیدا ہو جو کمزوریاں بھی رکھتا ہوگا لیکن فی الحقیقت ایمان لانے والا ہے اور ایمان لا کر خدمت دین میں مصروف رہنے والا ہے تو ایسے موقع پر دعا سے فائدہ اٹھائیں اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں۔

قرآن کریم کی جس آیت کی میں نے تلاوت کی تھی اس میں یہی دعا مذکور ہے۔ فرمایا وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا کہ وہ لوگ جو انصار اور مہاجرین کے بعد آئے کیونکہ پہلا جو مضمون ہے یہ انہی کا بیان ہو رہا ہے یعنی جنہوں نے براہ راست حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کی ویسی صحبت نہیں پائی جیسی مہاجرین اور انصار کو نصیب ہوئی۔ ان لوگوں کو کیا کرنا چاہئے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو یہ کرتے ہیں یہ خدا بیان فرما رہا ہے اور آنحضور ﷺ کی تربیت کے نتیجے میں وہ یہ پہلے سے دعا کر رہے ہیں۔ وہ دعا کیا ہے، يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ کہ اے ہمارے

رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ کہ جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جس کی یہ حالت ہے کہ بجائے اس کے کہ ان سے نفرت کریں یا جلیں یا ان کی نیکیوں پر طیش کھائیں کہ ان کو کیا توفیق مل رہی ہے یہ کیا اپنے طرف سے بڑے خدمتگار بنے ہوئے ہیں وہ ان کی نیکیوں کو ان کی کوششوں کو دیکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے خدا! ہمیں بھی بخش اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے۔ بخشنے کا کیا سوال پیدا ہوا ہے؟ بخشنے کا تعلق غلطی سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ان کی تربیت حضور اکرم ﷺ نے ایسی فرمائی تھی کہ جب وہ دوسرے کی غلطی دیکھتے تھے تو اس غلطی کو نفرت اور تنقید کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا تھا کہ ان سے بھی غلطیاں ہو رہی ہیں جو ہم سے پہلے تھے ایمان میں تو ہم سے کیوں نہ ہوئی ہوں گی۔ ہم تو بعد میں آنے والے ہیں اس لئے ہم ہو سکتا ہے ان سے بڑھ کر غلطیوں میں مبتلا ہوں۔ تو کسی کی غلطی دیکھ کر ان کا دل استغفار کی طرف مائل ہوتا تھا اپنے لئے بھی اور ان کے لئے بھی۔

سَبَقُوْنَا کا مضمون دو باتیں ظاہر کرتا ہے۔ ایک وہ جو ان آیات کے سیاق وسباق سے ظاہر ہو رہا ہے کہ زمانے کے لحاظ سے پہلے تھے اور ایک دوسرا مضمون ہے جو مستقلاً لفظ سبق میں داخل ہے اور وہ ہے سبقت لے جانا، آگے بڑھ جانا۔ تو اس دعا کو ان دونوں مفہوموں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔ یہ دعا صرف ان لوگوں سے تعلق میں نہیں ہے جو زمانے کے لحاظ سے پہلے تھے بلکہ ان لوگوں سے تعلق میں بھی ہے جو نیکیوں میں کسی لحاظ سے سبقت لے جا رہے ہیں اور چونکہ قرآن کریم نے حسد کے خلاف تعلیم دی ہے اور حسد رشک کی بگڑی ہوئی صورت ہوا کرتی ہے۔ رشک پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اس لئے قرآن کریم چونکہ باریک بیماریوں کا بھی علاج رکھتا ہے قرآن کریم نے اس طرف توجہ دلا دی کہ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے اس کے کہ یہ معاملہ بڑھے اور رشک حسد میں تبدیل ہو تم یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ! ہمیں بھی بخش ہم تو بعد میں ہیں یہ لوگ تو ہم سے سبقت لے گئے ہیں اور ان سے بھی غلطیاں ہو رہی ہیں ان کو بھی معاف فرما دے تو جو شخص اپنے کسی بھائی کی غلطی پر اس کی معافی کی دعا کر رہا ہو رات کی تنہائی میں اکیلے بیٹھ کر اس سے وہ بغض کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس مضمون کو مزید کھول دیا۔ فرمایا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہاں

سبقت کا مضمون پیچھے چھوڑ کر اس دعا کو زیادہ وسیع فرما دیا اور فرمایا وہ یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ اے خدا! ہمارے دل میں کسی ایمان لانے والے کے متعلق کوئی بغض، کوئی کجی پیدا نہ ہو، کوئی کینہ پیدا نہ ہو۔ صرف یہی نہیں کے جو پہلے بڑھ گئے ہیں یا آگے نکل گئے ہیں بلکہ ہر شخص جو ایمان لاتا ہے وقت کے منادی کرنے والے پر اس کے متعلق ہم تجھ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ہمارے دل میں غل نہ پیدا ہونے دینا، کسی قسم کا بغض نہ پیدا ہونے دینا۔

اس دعا کے نتیجے میں وہ سوسائٹی ابھرتی ہے، وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں مومن دوسرے مومن سے بھائی کی طرح محبت کرنے لگتا ہے اور وہ دعائیں بھی قرآن کریم میں بیان ہیں، وہ مضمون بھی الگ بیان ہیں لیکن یہ وہ ابتدائی منزل ہے جس سے دل اس حد تک صاف ہو جاتا ہے کہ پھر اس پر بھائی کی محبت کا نقش جم سکتا ہے۔ اگر غل پیدا ہو جائے تو ایسے دل پر پھر کوئی محبت کا نقش نہیں جم سکتا۔ تو یہ آیت دل کی صفائی سے اور تزکیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے بعد پھر دوسری قرآن تعلیم آپ کے دل پر نئے نئے حسین نقش جمائے گی اور آپ کو اپنے مومن بھائیوں کے لئے اپنے دلوں میں بے انتہا محبت محسوس ہوگی۔ تو یہ دو نصیحتیں ان کے لئے ہیں جو کسی قسم کے غل کا رجحان اپنے بھائیوں کے لئے رکھتے ہیں۔ اللہ ان کی دانشوری کو صحیح رستوں پر چلائے اور انہیں وہ عرفان نصیب کرے جو حقیقی دانشوری ہے کیونکہ دانشوری صرف عقل کا نام نہیں ہے، دانشوری عرفان کا نام ہے حقیقت میں اور اس کے نتیجے میں عقل کے ساتھ دل کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس میں ایک لذت پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا میں نے بالعموم بعض کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ یہ کمزوریاں بیرونی معاشرے سے لازماً ہمارے معاشرے میں سرایت کرنے کا رجحان رکھتی ہیں اور ہمیں ان کے خلاف ایک عظیم الشان جہاد کرنا چاہئے۔ کچھ منتظمین کو مخاطب کر کے یہ باتیں سمجھائی تھیں اور کچھ افراد کو مخاطب کرتے ہوئے سمجھانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ میں اب وقت کی رعایت سے ایک بات آج کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح لفظ فرّ استعمال ہوا مضمون کے تعلق میں ایک اور اسی لفظ کا ایک استعمال قرآن کریم میں ہمیں ملتا ہے اور وہ منفی معنوں میں نہیں بلکہ مثبت معنوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (الذاریات: ۵۱) تم اللہ کی طرف فرار اختیار کرو۔ فرار کس چیز سے ہوتا ہے؟ فرار ہمیشہ خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ عربی میں جو لفظ فرار ہے اس کے ایک طرف خوف کا عنصر پایا جاتا

ہے۔ کسی چیز سے بدک کر، دوڑ کر، گھبرا کر دوسری طرف بھاگنا۔ اب لفظ فرار بتا رہا ہے کہ تقویٰ کا اصل معنی یہ ہے۔ اگر تقویٰ کا مطلب خدا کا خوف ان معنوں میں ہو جو ہم عام معنوں میں خوف کے معنی سمجھتے ہیں تو پھر خدا سے دوڑنا چاہئے لیکن تقویٰ خدا کی طرف دوڑنے کا نام ہے اور کسی اور کے خوف کے نتیجے میں خدا کی پناہ میں آنے کو تقویٰ کہتے ہیں۔ بچنا خدا سے نہیں بلکہ خدا کی گود میں آ کر بچنا، خدا کی حفاظت میں آ کر بچنا اور وہ ہے گناہوں سے دوڑنا، گناہوں سے فرار اختیار کرنا۔

گناہوں سے فرار اختیار کرنے کے دو طریق ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ گناہ کو اس لئے ترک کر رہے ہیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ گناہ ہے، اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے اور آپ اس گناہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ جو طریق ہے یہ ثواب کے لحاظ سے تو اچھا ہے لیکن مشکل بہت ہے اور مسلسل انسان ایک جدوجہد میں مبتلا رہتا ہے اور مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔ ایک چیز اچھی لگ رہی ہے اور آدمی کہتا ہے نہیں خدا کی خاطر چھوڑنا ہے۔ ہر وقت اپنے نفس کی ایک خواہش کا انکار اس کے ساتھ جاری رہتا ہے اور ایسے لوگ پھر جب اکثر دعا کے لئے حالات اپنے لکھتے ہیں تو بہت پریشانی میں مطلع کرتے ہیں کہ گناہ ہم چھوڑتے ہیں خدا کی خاطر، جدوجہد کرتے ہیں، روتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں پھر دوبارہ یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو اگر اخلاص کے ساتھ یہ جدوجہد کی جائے تو بالآخر ایک لمبی تکلیف کے دور سے گزر کر انسان اس سے نجات پا جاتا ہے۔ یہ کوئی ناکام رہنے والا طریق نہیں ہے لیکن مشکل رستہ ہے۔ ایک اور طریق یہ ہے کہ گناہ کا عرفان پیدا کریں۔ گناہ کا بھی ایک عرفان ہوا کرتا ہے۔ گناہ کا شعور پیدا کریں اور اپنے خیالات میں، اپنے تفکرات میں بلوغت پیدا کریں۔ اب ایک خوبصورت رنگوں کا سانپ کسی بچے کو اچھا لگتا ہے، آپ کو بھی اچھا لگ رہا ہوتا ہے لیکن اگر وہ سانپ زہریلا ہو اور خطرناک ہو تو ایک بالغ نظر انسان بعض دفعہ اس رنگ سے ہی متنفر ہو جاتا ہے جو ایک سانپ کے اوپر یہ دلکشی پیدا کر رہا ہے۔ یعنی ایسا رد عمل ہوتا ہے کہ بعض رنگوں کو بعض زہروں سے تعلق کی بنا پر انسان ناپسند کرنے لگ جاتا ہے اور بعض دفعہ لاشعوری طور پر ایسے رنگوں سے بھی الرجی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے نظارے اور ایسا رنگ طبیعت میں ایسا رد عمل پیدا کرتے ہیں کہ انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔

یہ ایک بڑا وسیع تجربے کا مضمون ہے لیکن بچہ بیچارہ اس کو یہ تو پتا ہے کہ خوبصورت چیز ہے وہ

ہاتھ اس طرف بڑھاتا ہے لیکن اس کو یہ نہیں پتا کہ اس کے اندر کیا بدی پوشیدہ ہے، اس سے اس کو کیا نقصان پہنچے گا۔ اب ایسا بچہ اگر رکتا ہے تو ماں باپ کی نصیحت کی وجہ سے رکتا ہے اور بسا اوقات اس وقت تک رکتا ہے جس وقت تک ماں باپ اس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جب اس کا یہ شعور کہ ماں باپ مجھے دیکھ رہے ہیں اس کا ساتھ چھوڑ دے اور وہ واقعۃً یا اپنے خیال میں یہ سمجھ رہا ہو کہ میں ماں باپ کی نظر سے الگ ہو گیا ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ وہ اسی سانپ کے منہ میں پھر ہاتھ مار دے۔

انسان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ہر لمحہ، ہر وقت، خدا کو حاضر سمجھنا یہ بہت مشکل کام ہے اور بہت لمبے تجربے اور دعا کے نتیجے میں یہ وقفہ بڑھتا چلا جاتا ہے زندگی کے ساتھ ساتھ کہ انسان کو خدا کے حاضر ناظر ہونے کا احساس رہے اور اس منزل سے پہلے اتنے مراحل ہیں کہ بعض انسانوں کی زندگی میں بعض دفعہ سالوں میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جس میں ان کو خدا کے وجود کا شعور پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ بھول جاتے ہیں۔ بعضوں کی زندگی میں یہ مہینوں میں آتا ہے، بعضوں کی زندگی میں ہفتوں میں آتا ہے، بعضوں کی زندگی میں روز ایسے لمحے آنے لگتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے کیا ایسا لمحہ تمہارے دل پر نہیں آیا کہ خدا کے خوف، خدا کی خشیت سے تمہارے دل پارہ پارہ ہو جائیں اور کانپنے لگ جائیں۔ یہ وہ لمحات ہیں جو گناہوں سے بچاتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے شعور کے بڑھنے، اس کے پھیلنے، اس کی وسعت کے ساتھ ساتھ یہ گناہ سے بچنے کا مزاج بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تو اصل حقیقت یہی ہے کہ گناہ کے متعلق شعور پیدا کریں کہ یہ چیز خطرناک ہے اور بری ہے اور نقصان دہ ہے۔ بعض دفعہ یہ شعور اپنے تعلق سے پیدا نہیں ہوتا دوسرے کے تعلق سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اب نہایت گندے معاشرے میں جہاں ایک دوسرے کو بری نظر سے دیکھنا کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی وہاں بعض موقع پر لوگ ایک دوسروں کو ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں۔ اس نسبت سے وہ لمحے ہیں ان کے لئے شعور کے۔ وہ جب دوسرے کی ماں بہنوں سے وہ سلوک کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے دل میں کوئی چٹکی نہیں لی جاتی، کوئی تکلیف کا احساس پیدا نہیں ہوتا لیکن جب ایک مشتعل آدمی ان کو ان کے ماں بہن کے تعلق سے وہ باتیں کہتا ہے جو وہ دوسرے کی ماں بہنوں کے تعلق سے بالکل معمولی سمجھ رہے ہوتے ہیں تو دل میں ایک شدید درد پیدا ہوتی ہے، چٹکی لی جاتی ہے، کانٹے چبھتے ہیں اور بعض دفعہ مجرم ہونے کے باوجود اتنا مشتعل ہو جاتا ہے کہ ایسی باتیں کرنے والے کو قتل بھی کر دیتا

ہے۔ یہ اس کے لئے شعور کا ایک لمحہ ہے لیکن خدا کے تعلق سے نہیں اپنی انانیت کے تعلق سے۔ اس لئے ایسا شخص نجات نہیں پا سکتا بعض دفعہ اور مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

تو گناہ کی پہچان ان نسبتوں سے بھی کرنی چاہئے کہ گناہ ہے کیا؟ کیوں ہے؟ چوری اگر بری ہے تو چور کو یہ سوچنا چاہئے کہ اگر اس کی چوری ہو تو اس کو کیا تکلیف ہوتی ہے اور وہ معاشرے میں یہ تکلیف پہنچا رہا ہے۔ یعنی یہ ایک بالکل ابتدائی شکل ہے شعور کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان جو اولوالالباب ہو اس کو خدا تعالیٰ ایسے فہم عطا کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی نظر کو ایسی باریکی عطا کرتا چلا جاتا ہے کہ وہ گناہوں کی تہہ تک پہنچ کر ان کا شعور حاصل کرنے لگتا ہے اور جب شعور حاصل کر لے تو پھر یہ جدوجہد ختم ہو جاتی ہے کہ خدا نے منع کیا ہوا ہے اس لئے میں نے انگلی نہیں ڈالنی اس شیطان کے منہ میں۔ پھر انسان خود متنفر ہونے لگتا ہے ان چیزوں سے جہاں وہ پہلے لذت پاتا تھا ان میں لذت نہیں رہتی بلکہ گھبراہٹ پیدا ہو جاتی ہے، خوف پیدا ہو جاتا ہے۔

اس لئے بچپن سے ماں باپ کو گناہوں کے مضمون کو اپنی اولاد کو اس طرح سمجھانا چاہئے کہ گناہ کا شعور پیدا ہو جائے۔ خاص طور پر یہ نسخہ مغربی سوسائٹی میں استعمال کرنے کے لئے بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں آپ جتنا بھی چاہیں اپنی اولاد کو مغربی معاشرے سے بچانے کی کوشش کرتے چلے جائیں اگر وہ شعور سے عاری ہیں تو ان کی زندگی کے اکثر لمحات ایسے ہیں جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ نہ ماں باپ ہمیں دیکھ رہے ہیں، نہ ہمارا خدا ہمیں دیکھ رہا ہے پھر لذت جس طرف ان کو کھینچے گی وہ لازماً اس طرف جائیں گے کوئی دنیا کی طاقت ان کو روک نہیں سکتی۔

اس لئے گناہوں کا شعور اولاد کے دل میں پیدا کرنا اور ان کی تربیت کرنا اس معاملے سے کہ کوئی چیز کیوں منع ہے، اس میں کیا خرابیاں ہیں اور بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے تجربوں کے لئے ان کو ان خرابیوں کا احساس دلانا یہ ہے جس کا تعلیم کی حکمت سے تعلق ہے۔ پس اسی لئے حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کو جو دنیا کا سب سے بڑا مزکی قرار دیا گیا تو آپ کی تعریف میں یہ بات داخل فرمائی کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ (الجمعہ: ۳) اس شان کا مزکی آیا ہے کہ محض تعلیم پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ تعلیم کی حکمتیں بھی بیان فرماتا ہے۔ ان کو سمجھاتا ہے ان کے دل کے ساتھ ان کے دماغ کو قائل کرتا ہے یہاں تک کہ وہ گناہ کو گناہ سمجھ کر، ایک زہر سمجھ کر دیکھنے

لگ جاتے ہیں، اس کو پہچاننے لگ جاتے ہیں اور اس سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح مجذوم سے بھاگنے کا حکم ہے۔ پس فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ کا یہ مطلب ہے۔ اللہ کی طرف دوڑو اور یہ دوڑ شعور کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی آپ کو۔ اس دوڑ کی تحریک نہیں پیدا ہوگی دل میں جب تک آپ گناہ کا شعور حاصل نہیں کریں گے۔

یہ وہ مستقل چیزیں ہیں جن کے بغیر ہماری سوسائٹی لمبے عرصے تک سنبھالی نہیں جاسکتی۔ جو وقتی اقدامات ہیں وہ میں نے بیان کئے، جو سطحی اقدامات ہیں وہ بھی بیان کئے۔ یہ بھی بتایا کہ بعض دفعہ جراحی کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ بعض ایسے بھی لوگ ہوں گے جن کو آپ مجذوم سمجھ کر ان کی سوسائٹی میں جانا چھوڑ دیں لیکن یہ نسبتاً سطحی باتیں ہیں۔ **اصل بنیادی اور گہری بات یہی ہے کہ گناہ کے شعور سے ایک روحانی فراست نصیب ہوتی ہے۔ دونوں طرف معرفت کی ضرورت ہے۔ ایک معرفت دوسرے کی معرفت کو بڑھاتی ہے۔** اس لئے گناہ کا شعور حاصل کریں تو آپ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ کی حالت میں داخل ہو جائیں گے۔ خود بخود یہ شعور آپ کو دوڑائے گا اپنے خدا کی طرف اور کہیں اور پناہ نہیں ملے گی۔ یہی ہے بنیادی مفہوم تقویٰ کا جس کو سمجھے بغیر انسان کی سچی اصلاح ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ جماعت کو بالعموم ساری دنیا میں توفیق بخشے کہ جس عظیم اور نازک اور تاریخی اور نہایت اہم دور سے ہم گزر رہے ہیں اس کے تقاضے پورے کریں خدا کی عطا کردہ توفیق کے ساتھ اور گناہوں کو چھوڑیں لذت کے ساتھ تکلیف اور مصیبت کے ساتھ نہیں بلکہ پورے کامل اطمینان کے ساتھ کہ ہاں اب ہم امن میں آگئے ہیں اور یہ امن خدا کی گود کے سوا اور کہیں نصیب نہیں ہوسکتا۔